ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL (JALT)
Vol.9 No.1 2026

واجدہ تبسم کے افسانوی مجموعہ "تہہ خانہ" میں حقیقت پسندی کا رجحان

A STUDY OF REALISM IN WAJIDA TABASSUM'S SHORT STORY COLLECTION *TEHKHANA*

نجیبہ منان

اُردو لیکچرار شعبہ اُردو ویمن یونیورسٹی صوابی

سماں چمبیلی

بی ایس اُردو ویمن یونیورسٹی صوابی

Abstract:

This study explains realism in the short stories of Wajida Tabassum from her collection Tehkhana*. It shows how the writer presents family life, women's problems, human feelings, and social issues in a simple and realistic way. The study also explains the natural development of the characters and their emotions. It concludes that Wajida Tabassum's stories reflect real life and human experiences with honesty.*

Keywords:

Realism, Wajida Tabassum, *Tehkhana*, Society, Women, Human Emotions,

واجدہ تبسم کا شمار اُردو ادب کی نمایاں افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں اُردو افسانے کو منفرد انداز، جراتِ اظہار اور معاشرتی حقیقت نگاری سے نئی جہت دی۔ ان کا نام ان افسانہ نگاروں میں شامل ہے جنہوں نے انسانی نفسیات، جاگیردارانہ معاشرے، عورت کی زندگی، طبقاتی تفاوت اور اخلاقی تضادات کو بے باکی سے پیش کیا۔ ان کو اپنی تحریروں کی وجہ سے شہرت بھی ملی اور تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ انہوں نے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا جن پر اس دور میں کم لکھا جاتا تھا۔ انہوں نے خاص طور پر اپنے افسانوں میں حیدر آباد دکن کے جاگیردارانہ اور نوابی معاشرے کی حقیقت کو بے نقاب کیا۔ وہ خود اپنے بارے میں کہتی ہیں:

میں اپنا شمار ان انسانوں میں کرتی ہوں جو صرف حقیقت کا اظہار کرنا پسند کرتے ہیں۔ رسوائی کا بھی مجھے کوئی ایسا ڈر نہیں لیکن الزامات کی فہرست جب ضرورت سے زیادہ لمبی ہو جائے تو قلم اٹھانا ضروری ہو جاتا ہے۔[i]

۱۹۶۸ء کو منظرِ عام پر آنے والا ان کا افسانوی مجموعہ "تہہ خانہ" آٹھ افسانوں پر مشتمل ہے۔ پہلا عنوان میری کہانی کے نام سے ہے جس میں واجدہ تبسم نے اپنی زندگی کی کہانی اور افسانے لکھنے کے بارے میں بات کی ہے ان کی اپنی زندگی بھی کسی افسانے سے کم نہیں اور زندگی کی حقیقتوں کی تلخ ترجمانی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ ان افسانوں میں نفسیاتی تجزیے اور سماجی رویوں کی بے باک تصویر پیش کی گئی ہے۔

پہلے افسانے "تہہ خانہ" میں کئی سماجی حقیقتوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ذکیہ برسوں سے اولاد کی خواہش مند ہے۔ جب اس کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی زندگی میں خوشی آتی ہے، لیکن بچے کی اچانک موت اسے شدید صدمے میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس کے بعد جب وہ دیکھتی ہے کہ گھر والے اس کے غم کو پوری طرح محسوس کرنے کے بجائے بلی اور اس کے بچوں میں مصروف ہیں تو اس کے دل میں محرومی، حسد اور تنہائی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ نفسیاتی کیفیت حقیقت کے عین مطابق ہے، کیونکہ ایک ماں کے لیے اپنے بچے کی موت ناقابلِ برداشت دکھ ہوتی ہے، اور ایسے حالات میں دوسروں کی بے توجہی انسان کے غم کو مزید بڑھا دیتی ہے۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

افسانے میں بلی محض ایک جانور نہیں بلکہ مادری محبت کی علامت بن کر سامنے آتی ہے۔ جب بلی کے بچے غائب ہوتے ہیں تو وہ مسلسل بے چین رہتی ہے، شور مچاتی ہے اور اپنے بچوں کو تلاش کرتی پھرتی ہے۔ یہ منظر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اولاد سے محبت صرف انسانوں تک محدود نہیں بلکہ ہر جاندار کی فطری جبلت ہے۔ ذکیہ اسی منظر کو دیکھ کر محسوس کرتی ہے کہ اگر ایک جانور اپنے بچوں کے بغیر بے قرار ہو سکتا ہے تو انسانی ماں کا دکھ کس قدر گہرا ہو گا۔

ہمارے معاشرے میں عموماً سوتیلی ماں کو منفی کردار کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ واجدہ تبسم اس روایت کو حقیقت پسندانہ انداز میں بدلتی ہیں۔ ابتدا میں ذکیہ اپنے سوتیلے بچوں سے زیادہ وابستہ نہیں ہوتی کیونکہ اس کی ساری محبت اپنی اولاد سے وابستہ ہوتی ہے، لیکن زندگی کے تلخ تجربات اسے بدل دیتے ہیں۔ آخر میں وہ انہی بچوں کو اپنی محبت اور شفقت کا مرکز بنا لیتی ہے۔ یہ تبدیلی اچانک نہیں بلکہ نفسیاتی اور فطری انداز میں رونما ہوتی ہے، جو حقیقت پسندی کی نمایاں مثال ہے۔

شادی کو چھ سات سال تو ہو ہی چکے تھے۔ کیسے کیسے ارمان جی کو لگے ہوئے تھے۔ مگر انھیں دیکھ کر تو بجائے پیار کے ان کے آگ لگتی تھی۔ اپنے ہوتے تو کلیجے سے لگائے لگائے پھرتیں۔ مگر اب تو ان کی ہنسی، ان کی چیخ و پکار جیسے کانوں میں چھید ڈالتی۔ بات بے بات دھتکارا کرتیں۔ خواہ مخواہ ڈانٹ ڈپٹ کرتیں۔ غصے کی بات پر بھی غصہ اور پیار کی بات پر بھی غصہ۔[ii]

یہ افسانہ واجدہ تبسم کی حقیقت نگاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ مصنفہ نے ایک عام گھریلو واقعے کے ذریعے عورت کی محرومی، ماں کی فطری محبت، سوتیلی ماں کے بارے میں معاشرتی تصورات اور انسانی نفسیات کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ افسانے کا ہر واقعہ زندگی سے قریب محسوس ہوتا ہے، اور ذکیہ کے کردار میں آنے والی تبدیلی اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ انسانی رشتے خون کے تعلق سے زیادہ محبت، احساس اور ہمدردی پر قائم رہ سکتے ہیں۔

واجدہ تبسم نے عورت کے انہیں جذبات کو پیش نظر رکھ کر اپنے طور پر سعی کی ہے اور کہانیوں میں ایسی عورتوں کو موضوع بنایا ہے جو اولاد کی نعمت سے محروم ہیں۔[iii]

دوسرے افسانے ”ساتواں شہزادہ“ میں ایک بڑے مشترکہ خاندان کے اندر ماں کی انا، طبقاتی تفاوت، خاندانی اختیار، خاموش محبت، اور آخر کار ممتا کی فتح کو موضوع بنایا گیا ہے۔ بڑے مشترکہ خاندانوں میں والدین خصوصاً ماں کا اولاد کی شادی کے فیصلوں پر مکمل اختیار رکھنا ایک جانی پہچانی سماجی حقیقت ہے۔ اسی طرح اپنی مرضی سے شادی کرنے والے بچوں کو خاندان کی ناراضگی، بائیکاٹ اور جذباتی سزا کا سامنا کرنا بھی ہمارے معاشرے میں دیکھا جاتا ہے۔

مگر وہ تو خالہ بی تھیں اپنے نام کی۔ مرتی مر جاتی مگر کبھی یہ رسوائی نہ کرتیں کہ غیروں کی بیٹی ان کی بہو کہلائے۔ اور غیر بھی کیسی کہ جس کے خاندان کا اتہ پتہ نہ ذات پات کی خبر۔ کیا غیروں کی بیٹیاں نہیں اٹھایا کرتے؟ مگر وہ بھی ذرا تمیز سے، دیکھ بھال کے، ایسے نہیں کہ بس راہ چلتی کو دیکھا اور آنکھوں کا کاجل بنا لیا۔[iv]

افسانے میں چھوٹے میاں کا ایک کلرک کی بیٹی سے شادی کرنا طبقاتی فرق کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ماں کی مخالفت کا اصل سبب لڑکی کا کردار نہیں بلکہ اس کا سماجی اور معاشی پس منظر ہے۔ یہ رویہ بھی حقیقت پسندانہ ہے کیونکہ بعض خاندانوں میں رشتوں کو انسان کی خوبیوں کے بجائے خاندان، دولت اور سماجی حیثیت کی بنیاد پر پرکھا جاتا ہے۔

چھوٹے میاں کی خاموشی، گھر میں اجنبی بن جانا، صحت کا گرنا اور کسی سے شکایت نہ کرنا بھی نفسیاتی اعتبار سے حقیقت کے قریب ہے۔ جب انسان اپنے ہی گھر میں قبول نہ کیا جائے تو وہ اندر ہی اندر ٹوٹنے لگتا ہے۔ افسانے میں ایک اور حقیقت یہ ہے کہ باقی گھر کے افراد معمول کے مطابق خوشیاں مناتے رہتے ہیں جبکہ ایک فرد شدید ذہنی اذیت میں مبتلا ہوتا ہے۔ عملی زندگی میں بھی اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کا ذاتی دکھ پورے خاندان کی خوشیوں کو نہیں روکتا۔

آخر میں عید کے موقع پر ماں کا دل پگھل جانا اور بہو کے لیے قیمتی کپڑے بھیجنا حقیقت پسندانہ انجام ہے۔ اگرچہ وہ فوراً اپنے الفاظ واپس نہیں لیتی، لیکن اس کے عمل سے اس کی ممتا غالب آتی دکھائی دیتی ہے۔ اس طرح واجدہ تبسم یہ باور کراتی ہے کہ سخت ترین دل بھی وقت، احساس اور اولاد کی محبت کے سامنے نرم پڑ سکتا ہے۔

واجدہ تبسم انسانی جذبات، گھریلو زندگی، عورت کی نفسیات اور معاشرتی رشتوں کو حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کرنے کے لیے جانی جاتی ہیں۔ تیسرا افسانہ ”فاختہ“ بھی انہی عناصر کا عکاس ہے۔ افسانے میں ایک عام متوسط طبقے کے خاندان کی زندگی پیش کی گئی ہے۔ بشیر میاں کی بیوی کا تیسرے بچے کی پیدائش کے دوران انتقال، ایک شریف اور ذمہ دار باپ کا اپنے بچوں کے ساتھ رہ جانا، اور قریبی رشتہ داروں کا ایک دوسرے کا سہارا بننا، یہ سب ایسے واقعات ہیں جو معاشرے میں پیش آتے رہتے ہیں۔ مصنفہ نے کسی غیر معمولی یا تخیلاتی واقعے کے بجائے روزمرہ زندگی کی حقیقت کو بنیاد بنایا ہے۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JALT
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL

میناکا کردار بھی حقیقت پسندانہ انداز میں تشکیل دیا گیا ہے۔ وہ کم عمر ہونے کے باوجود گھر سنبھالتی ہے، بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہے اور بشیر میاں کی خدمت کرتی ہے۔ اس کے جذبات اچانک پیدا نہیں ہوتے بلکہ روزمرہ کی قربت، ذمہ داری اور ایک دوسرے کے احترام سے آہستہ آہستہ پروان چڑھتے ہیں۔ یہی تدریجی ارتقا حقیقت پسند ادب کی اہم خصوصیت ہے۔

بشیر میاں کا کردار بھی فطری معلوم ہوتا ہے۔ وہ بیوی کے انتقال کے بعد بچوں کی ذمہ داری اٹھاتا ہے، شائستہ اور باوقار رہتا ہے، اور مینا کے حسن سے متاثر ہونے کے باوجود جذبات میں بہہ کر کوئی غیر مناسب قدم نہیں اٹھاتا۔ اس کا مینا کے متعلق احساسات کو اپنے اندر رکھنا انسانی نفسیات کے مطابق ہے۔

> شبیر میاں گھر میں رہتے ضرور، مگریوں جیسے رہتے ہی نہ ہوں۔ نہ چٹ نہ پٹ، کبھی اونچی آواز سے بولتے، قہقہہ لگا کر ہنستے۔ ممانی بی جس ڈر سے انھیں اپنے گھر بلانے سے ڈرتی تھیں وہ بالکل ناممکن سی بات تھی۔ ایسے بھولے بھائی تھے کہ بُھولے سے بھی مینا کو آنکھ بھر نہ دیکھتے۔[v]

بچوں کا مینا کو اپنی ماں تسلیم کرنا بھی نفسیاتی اعتبار سے قابلِ فہم ہے۔ وہ مسلسل اس کی شفقت اور خدمت دیکھتے ہیں، اس لیے ان کے دل میں اس کے لیے ماں جیسا مقام پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی بات مینا کو اپنے جذبات کے اظہار کی ہمت دیتی ہے۔ افسانے کا آخری منظر نہایت معنی خیز ہے۔ پہلے مینا کہتی تھی:

"اے خانساماں، کھانا لگا دے، میاں آ گئے۔"

اس جملے میں "میاں" ایک عام خطاب ہے، جس سے صرف گھر کے سربراہ کی آمد کا اعلان ہوتا ہے۔ لیکن آخر میں وہ کہتی ہے:

"اے خانساماں، کھانا لگا دے، وہ آ گئے ہیں۔"!

یہاں "وہ" صرف ایک لفظ نہیں بلکہ تعلق کی تبدیلی کی علامت ہے۔ اب بشیر میاں اس کے لیے محض گھر کے مالک یا سرپرست نہیں رہے، بلکہ اس کی زندگی کے شریکِ حیات بننے والے انسان ہیں۔ ہمارے معاشرے میں عورت کا اپنے شوہر کے لیے "وہ" کہنا احترام، قربت اور ازدواجی تعلق کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ مصنفہ نے اسی معمولی لسانی تبدیلی کے ذریعے دونوں کرداروں کے رشتے میں آنے والی بڑی تبدیلی کو نہایت لطیف انداز میں ظاہر کیا ہے۔

چوتھے افسانے "سہاگن" کا مرکزی موضوع توہم پرستی، عورت کی مظلومیت، سماجی رویے، طبقاتی فرق، اور تقدیر و حقیقت کا تصادم ہیں۔ افسانے کی سب سے نمایاں حقیقت یہ ہے کہ معاشرہ ایک معصوم بچی کو ایسے جرم کی سزا دیتا ہے جس میں اس کا کوئی کردار نہیں۔ اختر صرف گیارہ برس کی تھی جب اس کا منگیتر سلیمان حادثاتی طور پر فوت ہو گیا، مگر لوگوں نے فوراً یہ کہنا شروع کر دیا کہ "لڑکی اپنے منگیتر کو کھا گئی" یہ جملہ حقیقت میں ہمارے معاشرے کی اس ذہنیت کی علامت ہے جہاں حادثات کا ذمہ دار بھی اکثر عورت کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ اختر کے حسن کے باوجود ہر رشتہ اس لیے ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ لوگ اسے منحوس سمجھتے ہیں۔ اس کی منگنی ریلوے ملازم سے ہوتی ہے مگر وہاں سے خط آتا ہے کہ "دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔" یہ محض ایک رشتہ ٹوٹنے کی کہانی نہیں بلکہ اس سماجی سوچ کی عکاسی ہے جہاں عورت کی شخصیت سے زیادہ اس کے متعلق پھیلی ہوئی باتوں پر یقین کیا جاتا ہے۔ حقیقت پسند ادب اسی قسم کی سماجی ناانصافیوں کو بے نقاب کرتا ہے غنچہ بیگم ان کے بارے میں لکھتی ہیں:

> واجدہ تبسم کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے کرداروں کے ذریعے سے روایت اور تغیر، قدیم اور جدید بدلتی ہوئی اخلاقی قدروں، معاشی مسئلوں، مذہبی اور سماجی اداروں، رسموں اور رہن سہن کے طریقوں کے راز فاش کیے ہیں۔[vi]

افسانے میں اختر بے حد حسین ہے۔ لیکن یہی حسن اس کے لیے راحت نہیں بلکہ مصیبت بن جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں "اتنی خوبصورت لڑکی ابھی تک گھر میں کیوں بیٹھی ہے؟" یہ جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورت کی خوبصورتی بھی اس پر دباؤ بن جاتی ہے۔ افسانہ اس تلخ حقیقت کو بھی سامنے لاتا ہے کہ اولاد ہمیشہ والدین کا سہارا نہیں بنتی۔ بیٹا ماں کی بات سننے کے بجائے اسے ٹال دیتا ہے۔ بہو ہر وقت اختر کو طعنے دیتی رہتی ہے۔ یہ کردار حقیقی زندگی سے لیے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ افسانے کا ایک مضبوط پہلو نفسیاتی حقیقت نگاری بھی ہے۔ بار بار طعنے سننے کے بعد اختر خود بھی اپنی جوانی اور حسن کے بارے میں سوچنے لگتی ہے۔ وہ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتی رہتی ہے۔ یہ اس کے اندر پیدا ہونے والے احساسِ محرومی اور ذہنی دباؤ کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ تبدیلی اچانک نہیں بلکہ مسلسل سماجی دباؤ کا نتیجہ ہے۔

شکور کا کردار حقیقت پسندانہ انداز میں طبقاتی تقسیم کو ظاہر کرتا ہے۔ بچپن میں وہ غریب تھا۔ اختر کے والد نے اسے پڑھایا، بعد میں وہ افسر بن گیا۔ اس کے باوجود اختر کا بھائی اسے اپنے خاندان کے برابر نہیں سمجھتا۔ یہ دیہی جاگیردارانہ ذہنیت کی واضح تصویر ہے۔ شکور افسانے کا سب سے باوقار کردار معلوم ہوتا ہے۔ وہ کبھی اختر کو بری نظر

سے نہیں دیکھتا۔ وہ اپنے محسنوں کی عزت کرتا ہے۔ اپنی محبت بھی خاموشی سے دل میں رکھتا ہے۔ یہ کردار ثابت کرتا ہے کہ اصل شرافت دولت سے نہیں بلکہ کردار سے پیدا ہوتی ہے۔

عارفہ بیگم کا مزار پر منت مانگنا دیہی معاشرے کے مذہبی اور ثقافتی رویوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ بھی حقیقت پسند افسانوں میں اکثر ملتا ہے کہ لوگ مشکلات میں روحانی مقامات سے امید وابستہ کرلیتے ہیں۔ جب اختر پانی میں ڈوب جاتی ہے تو عین اسی وقت شکور اس کا رشتہ مانگنے آتا ہے۔ یہ منظر انتہائی المیہ ہے، یہ بتاتا ہے کہ جب معاشرہ جاگتا ہے تب تک اکثر بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ افسانے کا سب سے طاقتور منظر آخری ہے، عارفہ بیگم پہلے مسکراتی ہے، پھر خوفناک قہقہہ لگاتی ہے۔ یہ عام ہنسی نہیں بلکہ برسوں کی محرومی، بیٹی کی بربادی، سماج کے ظلم، اپنی بے بسی، ٹوٹتی ہوئی امیدوں کا نفسیاتی اظہار ہے۔ یہ قہقہہ دراصل ایک ماں کی ذہنی شکست کی علامت ہے۔

میں آپ سے بھیک مانگ رہا ہوں خالہ بی، مجھے خالی ہاتھ نہ لوٹائیے۔ یقین کیجیے میں اختر کے بغیر مر جاؤں گا۔ ہاں کہہ دیجیے خالہ بی۔
خالہ بی کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ وسیع ہوگئی اور ان کے خوفناک قہقہے سنسان مزار کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر بُری طرح شور مچانے لگے۔[vii]

پانچویں افسانے "عیدی" حقیقت پسند افسانہ نگاری کی ایک عمدہ مثال ہے، کیونکہ اس میں زندگی کے عام مگر گہرے انسانی تجربات کو نہایت سادگی، خلوص اور فطری انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ واجدہ تبسم نے کسی غیر معمولی واقعے یا خیالی دنیا کی تخلیق کے بجائے روزمرہ زندگی کے ایسے حالات کو موضوع بنایا ہے جن سے معاشرے کا ہر فرد کسی نہ کسی صورت میں واقف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ قاری کو اپنے ماحول اور اپنی زندگی کا آئینہ محسوس ہوتا ہے۔ افسانے کی راوی ایک خوش حال اور دولت مند عورت ہے، مگر اس کی اصل دولت سونا، جواہرات یا قیمتی لباس نہیں بلکہ بچپن کی وہ محبت ہے جسے وہ ایک معمولی سی چونی کی صورت میں اپنے سینے سے لگائے رکھتی ہے۔ یہ احساس حقیقت پسند ادب کی بنیادی خصوصیت ہے کہ انسان کی اصل خوشی اور دولت مادی آسائشوں میں نہیں بلکہ خلوص، محبت اور یادوں میں پوشیدہ ہوتی ہے۔

افسانے میں یتیمی کا دکھ بھی نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ چھ سات سال کی بچی کا عید سے پہلے ماں سے محروم ہو جانا اور عید کے دن دوسرے بچوں کو نئے کپڑوں میں دیکھ کر رونا ایک ایسا منظر ہے جو انسانی فطرت اور معاشرتی حقیقت دونوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ عید جیسے خوشی کے موقع پر ماں کی کمی کا شدت سے محسوس ہونا ایک فطری احساس ہے، جسے افسانہ نگار نے کسی مبالغے کے بغیر بیان کیا ہے۔ نانی اماں کا غم زدہ ہونا اور پھر بچوں کو خوش رکھنے کے لیے اپنی سہیلی کے پاس بھیج دینا بھی ہمارے خاندانی نظام میں بزرگوں کی محبت اور ذمہ داری کا حقیقی عکس ہے۔

راحت بوا، جسے راوی دادی اماں کہتی ہے، کا کردار حقیقت پسندی کی ایک خوب صورت مثال ہے۔ وہ نہ دولت مند ہیں، نہ کسی بڑی حیثیت کی مالک، مگر ان کی محبت بے لوث اور خالص ہے۔ وہ بچوں کو نہلاتی ہیں، کھانا کھلاتی ہیں، سلاتی ہیں اور جاتے وقت اپنی استطاعت کے مطابق چونی عیدی کے طور پر دیتی ہیں۔ ان کے لیے یہ چونی شاید معمولی ہوں، مگر بچے کے لیے دنیا کی سب سے بڑی خوشی بن جاتے ہیں۔ یہ منظر اس حقیقت کی نمائندگی کرتا ہے کہ محبت کی قدر اس کی مالی قیمت سے نہیں بلکہ اس کے جذبے سے ہوتی ہے۔

یہاں وقت کی تبدیلی بھی حقیقت پسندانہ انداز میں دکھائی گئی ہے۔ تقسیمِ ہند، لوگوں کی ہجرت، مہنگائی کا بڑھ جانا، پرانے محلوں کا بدل جانا اور معاشی حالات کی تبدیلی سب ایسے حقائق ہیں جنہوں نے برصغیر کے لاکھوں خاندانوں کی زندگیوں کو متاثر کیا۔ افسانہ نگار ان تاریخی اور سماجی تبدیلیوں کا ذکر محض پس منظر کے طور پر نہیں کرتا بلکہ یہ دکھاتا ہے کہ وقت گزرنے کے باوجود بعض رشتے اور محبتیں اپنی اصل صورت میں قائم رہتی ہیں۔

راوی کی شادی ایک انتہائی امیر گھرانے میں ہوتی ہے، جہاں ہر طرح کی آسائش، قیمتی لباس، سونے کے زیورات اور شاہانہ زندگی موجود ہے، لیکن ان تمام ظاہری نعمتوں کے باوجود اس کے دل میں بچپن کی محبت کی قدر کم نہیں ہوتی۔ حقیقت پسند ادب کی یہی خوبی ہے کہ وہ انسان کی باطنی کیفیت کو مادی آسائشوں پر فوقیت دیتا ہے۔ یہاں یہ واضح ہوتا ہے کہ دولت انسان کو آرام تو دے سکتی ہے، مگر مخلص محبت اور اپنائیت نہیں خرید سکتی۔

افسانے کا سب سے مؤثر منظر وہ ہے جب راوی برسوں بعد دادی اماں سے ملنے جاتی ہے۔ ایک زمانے میں محبت سے بھرپور وہ عورت اب بڑھاپے، غربت اور نابینائی کا شکار ہو چکی ہے۔ ان کا چھوٹا سا گھر، کمزور جسم اور بینائی سے محرومی بڑھاپے کی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے ہر انسان دوچار ہو سکتا ہے۔ اس منظر میں کسی قسم کی مصنوعی جذباتیت نہیں بلکہ زندگی کی تلخ حقیقت پوری سادگی کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ اس کے باوجود دادی اماں کی محبت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ وہ حسبِ سابق راوی کی مٹھی میں چونی رکھ دیتی ہیں اور وہی پرانا سوال کرتی ہیں کہ "اس سے کیا کیا لوگی؟" اس لمحے میں وقت جیسے رک جاتا ہے؛ حالات بدل جاتے ہیں مگر محبت کا جذبہ نہیں بدلتا۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

> ہاں بی بی پرَ میرے لیے تو تُو آج بھی وہی ننھی سی بچی ہے جو میرے ہاتھوں کے بنے نوالے، کھا کہ میرے بستر میں ہی سو جایا کرتی تھی۔ ایک دم اُنھوں نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھ کر کسی کو پکارنا شروع کیا۔ اری زینو، او زینو۔۔۔ کچھ سوئیاں میٹھا ہو تو یہاں دے جا۔۔۔ میری بی بی آئی ہے۔[viii]

افسانے میں چونی محض ایک سکہ نہیں بلکہ ایک علامت ہے۔ یہ بے غرض محبت، شفقت، بچپن کی معصوم یادوں، خاندانی تعلق اور انسانی خلوص کی علامت بن جاتی ہے۔ راوی اسی چونی کو لاکٹ میں محفوظ رکھتی ہے۔ بظاہر لوگ سمجھتے ہیں کہ اس لاکٹ میں کسی محبوب کی تصویر ہو گی، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس میں ایک ایسی یاد محفوظ ہے جس کی قیمت دنیا کے تمام زیورات سے زیادہ ہے۔ اس حقیقت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ بعض معمولی چیزیں انسان کی پوری زندگی کا سرمایہ بن جاتی ہیں۔

افسانہ طبقاتی فرق کو بھی نہایت لطیف انداز میں نمایاں کرتا ہے۔ ایک طرف راوی کی شاہانہ زندگی ہے اور دوسری طرف دادی اماں کی تنگ دستی، مگر محبت کے رشتے میں یہ فرق کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ راوی اس بات پر شکر ادا کرتی ہے کہ دادی اماں نابینا ہیں اور وہ اسے قیمتی لباس اور زیورات میں نہیں دیکھ سکتیں، کیونکہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ دادی اماں کی محبت کے سامنے اس کی ساری دولت بے معنی ہے۔ یہ احساس انسانی عظمت اور اخلاقی شعور کی ایک حقیقی تصویر پیش کرتا ہے۔

اس افسانے کی زبان، کردار، ماحول اور واقعات سب زندگی کے عین مطابق ہیں۔ کردار نہ غیر معمولی ہیں اور نہ ہی ان کے اعمال میں کوئی مصنوعی پن ہے۔ ایک یتیم بچی، ایک غم زدہ نانی، ایک مہربان بزرگ خاتون، وقت کی گردش، بڑھاپا، غربت، دولت، یادیں اور محبت یہ سب عناصر ہمارے معاشرے کا حصہ ہیں۔ اسی لیے یہاں حقیقت پسند ادب کی تمام بنیادی خصوصیات، یعنی زندگی کی سچی عکاسی، سماجی حقیقت، نفسیاتی صداقت، فطری کردار نگاری اور انسانی جذبات کی سادگی نظر آتی ہے۔

چھٹا افسانہ "شہرِ ممنوع" میں معاشرے کی ان تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کیا گیا ہے جو خصوصاً عورت کی زندگی سے وابستہ ہیں۔ واجدہ تبسم نے زندگی کو کسی رومانوی یا خیالی رنگ میں پیش کرنے کے بجائے اسے اس کی اصل صورت میں دکھایا ہے، جہاں انسان کی خواہشات اکثر سماجی روایات، فرسودہ رسموں اور قسمت کے بے رحم فیصلوں کے نیچے دب جاتی ہیں۔ افسانے کے تمام کردار، واقعات اور ماحول حقیقی زندگی سے قریب محسوس ہوتے ہیں، اسی لیے قاری اس کہانی کو محض ایک افسانہ نہیں بلکہ معاشرے کی ایک زندہ تصویر سمجھتا ہے۔ غنچہ بیگم واجدہ تبسم کے بارے میں لکھتی ہیں:

> واجدہ تبسّم کی کہانیوں کا بنیادی محور حیدر آبادی زبان میں حیدر آباد دکن کا زوال پذیر معاشرہ ہے۔ ان کہانیوں کی بنیاد وہ عالیشان محلات ہیں جن کی دیواریں گرتی جاتی ہیں اور ان دیواروں کے ساتھ ایک پوری تاریخ زمین میں دفن ہو جاتی ہے۔ نوابوں کے محلات کی ڈیوڑھیوں کی غم انگیز داستان ان کی کہانیوں کے موضوعات ہیں۔ ان ڈیوڑھیوں کی تلخ حقیقت نگاری پر اُنھیں لعن طعن بھی سننا پڑا۔[ix]

افسانے کا آغاز ہی مردانہ ذہنیت اور عورت کو جسمانی حسن کی بنیاد پر پرکھنے کی سماجی حقیقت سے ہوتا ہے۔ مدن میاں صرف اس لیے ایک دوسری لڑکی سے شادی کا فیصلہ کر لیتے ہیں کہ اس کی پنڈلی پر ایک خوبصورت تل دیکھ لیتے ہیں اور اپنے ذہن میں اس کے جسم کے حسن کے بارے میں خیالی تصورات قائم کر لیتے ہیں۔ اس کے برعکس شجو، جو برسوں سے ان سے منسوب تھی، ایک لمحے میں نظر انداز کر دی جاتی ہے۔ افسانہ اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ بہت سے معاشروں میں عورت کی شخصیت، احساسات اور کردار سے زیادہ اس کے ظاہری حسن کو اہمیت دی جاتی ہے، اور مرد کا فیصلہ ہی عورت کی قسمت کا تعین کر دیتا ہے۔

شجو کی زندگی حقیقت پسندانہ انداز میں ان ہزاروں لڑکیوں کی نمائندگی کرتی ہے جن کی منگنی کسی وجہ سے ٹوٹ جائے تو پورا معاشرہ انہیں ایک مسئلہ سمجھنے لگتا ہے۔ افسانے میں لوگوں کا یہ کہنا کہ "منگنی ہوئی بیٹی کی بات ٹوٹ جائے تو یہ بہت بڑی خرابی ہے" اس سماجی سوچ کی عکاسی کرتا ہے جہاں رشتہ ٹوٹنے کا داغ صرف لڑکی پر لگایا جاتا ہے، حالانکہ اس میں اکثر اس کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ شجو کی چھوٹی بہن کی شادی ہو جاتی ہے مگر شجو برسوں انتظار کرتی رہتی ہے۔ یہ صورتِ حال ہمارے معاشرے میں عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے غیر مساوی رویے کی حقیقت پسندانہ تصویر ہے۔

> بھلے شجو کوئی حرامی پلہ جن ڈالتی تو اتنی خرابی نہ ہوتی، مگر منگنی ہوئی بیٹی کی بات ٹوٹ کو تو۔۔۔ او نہوں، یہ تو بڑی ناممکن سی بات ہے۔[x]

افسانے میں شجو کی نفسیاتی کیفیت کو نہایت باریک بینی سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ بچپن میں دادی اماں کی سنائی ہوئی شہزادی کی کہانی کو اپنی زندگی سے جوڑ لیتی ہے اور ہر روز اس امید میں جیتی ہے کہ ایک دن اس کے لیے بھی کوئی شہزادہ آئے گا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ کہانی اس کی امید کا سہارا بن جاتی ہے۔ حقیقت پسند ادب کی ایک اہم خصوصیت یہی ہے کہ وہ انسان کی باطنی دنیا اور نفسیاتی کشمکش کو حقیقی انداز میں پیش کرتا ہے۔ شجو کا ہر موڑ پر اپنی زندگی کو کہانی کے واقعات سے ملانا اس کے احساسِ محرومی، تنہائی اور محبت کی فطری خواہش کا اظہار ہے۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL (JALT)
Vol.9 No.1 2026

افسانہ یہ بھی دکھاتا ہے کہ عمر گزرنے کے ساتھ عورت کس طرح اپنے وجود کو معاشرتی پیمانوں پر جانچنے لگتی ہے۔ جب شجو سفید لباس پہنتی ہے، اپنے بالوں میں سفیدی دیکھتی ہے اور محسوس کرتی ہے کہ اس کی جوانی ڈھل رہی ہے تو اس کے خواب بھی مدھم ہونے لگتے ہیں۔ یہ منظر عورت کی نفسیاتی شکست اور وقت کی بے رحمی کا نہایت حقیقی اظہار ہے۔ واجدہ تبسم نے کسی مبالغے کے بغیر اس احساس کو پیش کیا ہے کہ معاشرہ عورت کی عمر کو اس کی شادی سے اس طرح جوڑ دیتا ہے کہ وہ خود بھی اپنی زندگی کو اسی پیمانے سے دیکھنے لگتی ہے۔

نصیر الدین کا کردار بھی حقیقت نگاری کا ایک اہم پہلو ہے۔ وہ تعلیم یافتہ، مہذب اور سنجیدہ انسان ہے۔ اس کی شجو سے گفتگو، اس کا احترام اور قربت شجو کے دل میں ایک نئی امید پیدا کر دیتے ہیں۔ جب وہ یہ کہتا ہے کہ اب اسے کوئی پسند آگیا ہے اور دعا کرنا کہ وہ مل جائے، تو شجو فطری طور پر یہی سمجھتی ہے کہ اشارہ اسی کی طرف ہے۔ یہ انسانی نفسیات کی ایک بالکل حقیقی کیفیت ہے کہ امید کا منتظر انسان معمولی اشاروں کو بھی اپنی خواہش کی تعبیر سمجھنے لگتا ہے۔ مگر جب اچانک نصیر کی شادی کی خبر آتی ہے تو شجو کے تمام خواب ٹوٹ جاتے ہیں۔ یہ انجام زندگی کی اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ انسان کی امیدیں ہمیشہ حقیقت میں تبدیل نہیں ہوتیں۔

دادی اماں کی کہانی پورے افسانے میں ایک علامتی حیثیت رکھتی ہے۔ شہزادی اور شہزادے کی داستان دراصل ان خوابوں اور سماجی تصورات کی علامت ہے جو لڑکیوں کے ذہن میں بچپن سے بٹھا دیے جاتے ہیں۔ شجو اسی کہانی کے سہارے زندگی گزارتی ہے، مگر جب حقیقت اس کے برعکس ثابت ہوتی ہے تو وہ غصے میں دادی اماں سے کہتی ہے کہ ایسی کہانیاں سنا کر اپنا وقت اور دوسروں کی زندگی برباد نہ کریں۔ یہ جملہ محض دادی اماں سے شکوہ نہیں بلکہ ان تمام معاشرتی خوابوں اور رومانوی تصورات کے خلاف احتجاج ہے جو عورتوں کو حقیقت سے دور رکھتے ہیں۔

افسانے کا اختتام بھی حقیقت پسندانہ ہے۔ شجو نہ خودکشی کرتی ہے، نہ پاگل ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی غیر معمولی معجزہ رونما ہوتا ہے، بلکہ وہ اپنے دکھ کو دل میں سمیٹ کر دوبارہ بچوں کو پڑھانے بیٹھ جاتی ہے۔ یہی حقیقت پسند ادب کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ زندگی کو اسی طرح پیش کرتا ہے جیسے وہ حقیقت میں گزرتی ہے۔ انسان شدید صدمے کے باوجود اپنی روزمرہ زندگی جاری رکھنے پر مجبور ہوتا ہے، اور شجو بھی اسی حقیقت کی نمائندہ بن جاتی ہے۔

ساتویں افسانے ”کانچ کا دل“ میں واجدہ تبسم نے زندگی کو کسی رومانوی رنگ یا غیر حقیقی واقعات کے ذریعے نہیں بلکہ عام گھریلو ماحول، فطری کرداروں اور روزمرہ کے انسانی تجربات کے ذریعے بیان کیا ہے۔ یہی خصوصیت حقیقت پسند ادب کا بنیادی وصف ہے کہ وہ معاشرے کی اصل تصویر قاری کے سامنے رکھتا ہے۔ واجدہ تبسم کے بارے میں ڈاکٹر ضمیر اللہ کچھ یوں رقم طراز ہیں:

> ان کے افسانے جن واقعات سے ترتیب پاتے ہیں وہ ان کے ارد گرد پھیلا ہوا معاشرہ ہے اور خود ان کے ماحول اور مزاج کی گہری چھاپ ان کے افسانوں میں موجود ہے۔[xi]

افسانے کا آغاز ہی ایک تلخ سماجی حقیقت سے ہوتا ہے۔ تین بیٹیوں کے بعد بیٹے کی پیدائش پر ماں کا انتقال ہو جاتا ہے اور گھر کے لوگ نومولود شمیم کو منحوس سمجھتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ ”یہ اپنی ماں کو کھا گیا ہے۔“ یہ رویہ ہمارے معاشرے میں موجود اس توہم پرستانہ سوچ کی عکاسی کرتا ہے جس میں کسی حادثے یا موت کا الزام ایک معصوم بچے یا عورت پر ڈال دیا جاتا ہے۔ حقیقت پسند افسانہ نگار نے اس فرسودہ ذہنیت کو بغیر کسی تبصرے کے کرداروں کے ذریعے نمایاں کیا ہے، جس سے معاشرے کی ایک تلخ حقیقت خود بخود سامنے آجاتی ہے۔

رفو بیگم کا کردار افسانے کا سب سے مضبوط اور مؤثر کردار ہے۔ وہ کم عمری میں بیوہ ہو جاتی ہے، لیکن اپنی ذاتی زندگی اور دوبارہ شادی کے امکانات پر توجہ دینے کے بجائے اپنے یتیم بھتیجے کی پرورش کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتی ہے۔ وہ اسے اپنی اولاد کی طرح پالتی ہے، اس کی ہر ضرورت پوری کرتی ہے، اس کی خاطر اپنے بھائیوں اور دوسرے رشتہ داروں سے اختلاف بھی مول لیتی ہے اور آخرکار اپنی تمام جائیداد بھی اس کے نام کر دیتی ہے۔ یہ کردار اس حقیقت کی نمائندگی کرتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں بعض عورتیں اپنے ذاتی مفادات اور خواہشات قربان کر کے دوسروں کی زندگی سنوارنے میں اپنی پوری عمر گزار دیتی ہیں۔

یہاں ماں اور اولاد کے رشتے کی نفسیاتی حقیقت بھی نہایت گہرائی سے پیش کی گئی ہے۔ اگرچہ رفو بیگم شمیم کی حقیقی ماں نہیں ہوتی، لیکن اس کی محبت، قربانی اور شفقت کسی حقیقی ماں سے کم نہیں۔ دوسری طرف شمیم بھی بچپن سے انہیں امی کہہ کر پکارتا ہے اور انہی کی گود میں پرورش پاتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ماں کا رشتہ صرف خون سے نہیں بلکہ محبت، قربانی اور مسلسل شفقت سے بھی قائم ہوتا ہے۔ واجدہ تبسم نے اس جذبے کو نہایت فطری انداز میں پیش کیا ہے۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

افسانہ انسانی نفسیات کی ایک اور حقیقت کو بھی نمایاں کرتا ہے کہ انسان اپنی اصل ماں کی یاد اور اس کی کمی کو کبھی مکمل طور پر فراموش نہیں کر سکتا۔ شادی جیسے خوشی کے موقع پر بھی شمیم کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ اگر اس کی حقیقی ماں زندہ ہوتی تو آج کتنی خوش ہوتی۔ یہ ایک بالکل فطری احساس ہے، کیونکہ انسان زندگی کے اہم مواقع پر اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں کو ضرور یاد کرتا ہے۔

افسانے کا اختتام انتہائی علامتی اور المیہ ہے۔ جب شمیم اپنی حقیقی ماں کا ذکر کرتا ہے تو رفو بیگم یہ سن کر گر پڑتی ہیں۔ ان کا دل برسوں سے صرف شمیم کی محبت اور اس کی خوشی کے سہارے زندہ تھا۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی، جوانی، دولت اور خواہشات اسی بچے پر نچھاور کر دی تھیں، اس لیے اس لمحے انہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام تر قربانیوں کے باوجود شمیم کی حقیقی ماں کی جگہ نہیں لے سکیں۔ افسانے کا عنوان "کانچ کا دل" بھی اسی حقیقت کی علامت ہے کہ بعض انسانوں کے دل کانچ کی طرح نہایت نازک ہوتے ہیں، جو بظاہر مضبوط دکھائی دیتے ہیں مگر ایک معمولی جذباتی صدمہ بھی انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔

آٹھویں افسانے "اے رودِ موسیٰ" میں تقسیمِ ہند کے بعد پیدا ہونے والے سماجی، معاشی اور نفسیاتی مسائل کو ایک عورت کی زندگی کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ افسانے کی راوی خود مہر ہے، جو واحد متکلم کے انداز میں اپنی داستان سناتی ہے، اس لیے قاری اس کے دکھ، خوف، محرومی اور بے بسی کو براہِ راست محسوس کرتا ہے۔

افسانے کی پہلی نمایاں حقیقت تقسیمِ ہند کے انسانی المیے کی عکاسی ہے۔ مہر اور اس کا خاندان حیدرآباد کی خوشحال زندگی، حویلی اور آسودگی چھوڑ کر پاکستان آ جاتا ہے، مگر یہاں انہیں غربت اور بے بسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لاکھوں مہاجر خاندانوں کی یہی حقیقت تھی کہ وہ اپنی جائیداد، رشتے اور شناخت کھو کر نئے ملک میں مشکلات کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔ واجدہ تبسم نے اس تاریخی حقیقت کو کسی مبالغے کے بغیر ایک خاندان کی زندگی میں سمو دیا ہے۔ واجدہ تبسم ایک جگہ اسی حقیقت کو یوں بیان کرتی ہیں:

> ہندوستان اور پاکستان دو ٹکڑوں میں بٹے۔ لیکن میں کئی ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ میرے دل اور ذہن کے کچھ ٹکڑے تو میرے وطن امراوتی میں رہ گئے کچھ حیدرآباد دکن کو ہجرت کر گئے۔[xii]

افسانہ عورت کے استحصال کی ایک تلخ حقیقت بھی پیش کرتا ہے۔ مہر کی غیر معمولی خوبصورتی اس کے لیے نعمت کے بجائے مصیبت بن جاتی ہے۔ اس کا بھائی، جو اس کا محافظ ہونا چاہیے، غربت اور دولت کی خواہش میں اسے ایک عمر رسیدہ نواب کے ہاتھ فروخت کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہاں عورت کو ایک آزاد انسان نہیں بلکہ ایک ایسی شے کے طور پر دیکھا جاتا ہے جسے مالی فائدے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ صورتِ حال ہمارے معاشرے میں موجود مردانہ بالادستی اور عورت کی بے اختیاری کی حقیقت کو نمایاں کرتی ہے۔ ترنم ریاض واجدہ تبسم کے بارے میں کچھ یوں رقم طراز ہیں:

> واجدہ تبسم نے مسلم سماج کے ایک مخصوص طبقے، یعنی نوابوں کے استحصالی نظام کو بے نقاب کر کے خاصی شہرت حاصل کی۔۔۔ ان کے ناول اور افسانے گو ایک مخصوص تہذیبی اور معاشرتی پس منظر میں لکھے گئے ہیں، تاہم یہ تحریریں موضوعات اور زبان و بیان کے اعتبار سے خواتین اردو ادب میں ایک منفرد اور بے باک رجحان کا اعلان کرتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں سماجی اور معاشی دباؤ میں کچلی ہوئی عورتوں کی نفسیات، ذہنی رجحانات اور ذاتی ردعمل (Individual Response) کی مکمل عکاسی نظر آتی ہے۔[xiii]

بھائی کا کردار حقیقت پسندانہ انداز میں انسانی کمزوری اور اخلاقی زوال کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ بہن کی خواہش، عزت اور مستقبل کی پروا کیے بغیر دولت کے لالچ میں اس کی زندگی کا فیصلہ کرنا چاہتا ہے۔ جب مہر انکار کرتی ہے تو وہ اسے گالیاں دیتا ہے، تشدد کرتا ہے اور بے عزت کرتا ہے۔ گھریلو تشدد اور عورت کی آواز کو دبانے کا یہ رویہ ایک ایسی سماجی حقیقت ہے جسے حقیقت پسند افسانہ نگار نے پوری جرات کے ساتھ پیش کیا ہے۔

افسانے میں مہر کا گھر چھوڑنا بھی ایک حقیقت پسندانہ مرحلہ ہے۔ وہ کسی رومانوی آزادی کی تلاش میں نہیں نکلتی بلکہ ظلم اور ذلت سے بچنے کے لیے گھر چھوڑنے پر مجبور ہوتی ہے۔ مگر گھر سے نکلنے کے بعد اسے معلوم ہوتا ہے کہ معاشرہ ایک بے سہارا عورت کے لیے کتنا بے رحم ہے۔ وہ بھوک، بے گھری، خوف اور غیر یقینی حالات کا سامنا کرتی ہے۔ یہ تمام واقعات ان عورتوں کی زندگی کی حقیقی تصویر ہیں جو کسی مجبوری میں گھر سے نکلتی ہیں اور معاشرے کی بے حسی کا شکار ہو جاتی ہیں۔

> میں گھر سے نکل تو گئی مگر معلوم نہ تھا کہ کہاں جاؤں گی۔۔۔ کدھر جاؤں گی۔۔۔ ایک جوان اور خوبصورت عورت کے لیے دنیا میں جگہ ہو بھی کہاں سکتی ہے۔۔۔؟[xiv]

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

افسانہ انسانی نفسیات کی نہایت گہری عکاسی بھی کرتا ہے۔ جب مہر ندی کے کنارے پانی پیتی ہے اور عورتیں اس کے حسن کو دیکھ کر اسے آوارہ روح سمجھ کر بھاگ جاتی ہیں تو وہ دل ہی دل میں سوچتی ہے کہ اس کے چہرے کی خوبصورتی تو سب کو نظر آتی ہے، مگر اس کے دل کے زخم کوئی نہیں دیکھتا۔ یہ افسانے کا ایک اہم نفسیاتی نکتہ ہے، جو ظاہر اور باطن کے فرق کو نمایاں کرتا ہے۔

افسانے میں غربت اور بھوک کی تصویر کشی نہایت مؤثر میں کی گئی ہے۔ مہر کا فقیر کی بچی ہوئی روٹی کھانا، کچرے سے کیلے کے چھلکے اٹھا کر کھانا، قبرستان میں رات گزارنا اور ہر وقت بھوک سے لڑنا ان تلخ حقیقتوں کی عکاسی کرتا ہے جن کا سامنا بے گھر اور بے سہارا افراد کرتے ہیں۔ واجدہ تبسم نے غربت کو صرف ایک معاشی مسئلہ نہیں بلکہ انسانی عزتِ نفس کو مجروح کرنے والی حقیقت کے طور پر پیش کیا ہے۔

بازار کے مناظر اور لوگوں کی گندی نظریں بھی حقیقت پسندانہ اسلوب کا اہم حصہ ہیں۔ مہر جہاں بھی جاتی ہے، مرد اسے ایک انسان کے بجائے ایک جسم کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ وہ خود بھی شدید بھوک اور بے بسی کے عالم میں جسم فروشی کا خیال کرتی ہے، لیکن اسی تصور سے خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ یہ کشمکش اس کی اخلاقی تربیت، خودداری اور مجبوری کے درمیان جاری ایک حقیقی نفسیاتی جنگ کو ظاہر کرتی ہے۔

ہوٹل کا منظر افسانے کا ایک فیصلہ کن موڑ ہے۔ ادھیڑ عمر کا شخص مہر کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے، مگر جلد ہی واضح ہو جاتا ہے کہ اس کی نیت مدد نہیں بلکہ استحصال ہے۔ جب وہ مہر کو ''تم جیسی عورتیں'' کہہ کر مخاطب کرتا ہے تو مہر پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ معاشرہ اب اسے ایک بے سہارا انسان نہیں بلکہ ایک قابلِ فروخت عورت سمجھنے لگا ہے۔ یہ جملہ اس کی شخصیت، عزت اور شناخت پر گہرا وار ثابت ہوتا ہے اور اسی لمحے اس کی تمام امیدیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ یہ منظر عورت کے بارے میں معاشرتی تعصب اور استحصالی سوچ کی انتہائی حقیقت پسندانہ عکاسی کرتا ہے۔

> میں بہت بدنصیب لڑکی ہوں___ آپ نہیں سمجھ سکتے کہ میں کن مصیبتوں میں گھری ہوں___ اس نے میری بات یوں ہی کاٹ دی___ آپ اپنے دُکھ ایک لمحے کو اپنے دل میں محفوظ رکھئے پہلے میری بات سُنئے، مگر میں اُس کی بات نہیں سُن رہی تھی___ کوئی بھی ایسا دل والا نہیں ملتا جو غم نصیب کے دُکھ کو اپنے سینے میں منتقل کر لے۔ وہ مجھے مخاطب کر کے کہنے لگا___
>
> آپ جانتی ہیں میں آپ کو یہاں کس لیے لایا ہوں___؟ آپ جیسی عورتیں رات گزارنے تو بہت سے مرد لے جاتے ہوں گے مگر___ مگر اس کے بعد میں نے کچھ نہ سُنا۔۔۔ ہوٹل میں جیسے طوفان آگیا تھا___ بادلوں کی گرج اور جہازوں کی کھڑ کھڑاہٹ سے بڑھ کر کوئی گونج گرج تھی جو مجھے بھلا رہی تھی۔۔۔۔ میں نے کانوں پر اپنے ہاتھ رکھ لئے اور تیزی سے اٹھ بھاگی۔[xv]

افسانے کا اختتام بھی حقیقت پسندانہ اور علامتی دونوں حیثیتیں رکھتا ہے۔ مہر اپنی پوری داستان دریا سے مخاطب ہو کر بیان کرتی ہے اور آخر کار خود کو پانی کے سپرد کر دیتی ہے۔ دریا یہاں صرف پانی نہیں بلکہ ایک خاموش سامع، فطرت کی آغوش اور اس معاشرے کے مقابلے میں ایک ایسی قوت کی علامت ہے جو انسان کا دکھ بغیر فیصلہ کیے سن لیتی ہے۔ مہر کا یہ آخری قدم اس سماجی نظام کے خلاف خاموش احتجاج بن جاتا ہے، جس نے ایک بے گناہ، خوددار اور باعزت عورت کے لیے جینے کی تمام راہیں بند کر دی تھیں۔

اس افسانے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جب معاشرہ ایک بے سہارا انسان سے اس کی عزت، تحفظ اور امید سب کچھ چھین لیتا ہے تو اس کے پاس زندگی سے دستبردار ہونے کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔ یہی تلخ سماجی حقیقت اس افسانے کی فنی قوت اور حقیقت نگاری کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔ ''اے رودِ موسیٰ'' صرف ایک دریا کو پکارنے کا نام نہیں، بلکہ ایک ایسی علامتی پکار ہے جس میں مہر انسانوں سے انصاف نہ ملنے پر فطرت کو اپنا راز دار بناتی ہے۔ دریا اس کے دکھ، تنہائی اور بے بسی کا خاموش گواہ بن جاتا ہے۔

حوالاجات:

---

i قوسِ خیال، واجدہ تبسم، افسانوی مجموعہ ''اترن'' اور سیز بک سینٹر، بمبئی، طبع اول، ۱۹۷۷ء، ص ٦

ii واجدہ تبسم، تہہ خانہ، اسرار کریمی پریس، الہ آباد، ۱۹٦۸، ص ۳۸

iii غنچہ بیگم، واجدہ تبسم کے افسانوی ادب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی جامعہ پشاور، ۲۰۱۹ء، ص ٦٦

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL

iv واجدہ تبسم، تہہ خانہ، اسرار کریمی پریس، الہ آباد، ۱۹۶۸،، ص ۴۸

v ایضاً، ص ۸۴

vi غنچہ بیگم، واجدہ تبسم کے افسانوی ادب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی جامعہ پشاور، ۲۰۱۹ء، ص ۶۱

vii واجدہ تبسم، تہہ خانہ، اسرار کریمی پریس، الہ آباد، ۱۹۶۸، ص ۱۱۳

viii ، ایضاً، ص ۱۲۳

ix غنچہ بیگم، واجدہ تبسم کے افسانوں میں مشرقی تہذیبی زندگی کے عناصر (khayban.uop.edu.pk(date:27,07,2026,10:50pm

x واجدہ تبسم، تہہ خانہ، اسرار کریمی پریس، الہ آباد، ۱۹۶۸، ص ۱۴۴

xi ضمیر اللہ، ڈاکٹر، واجدہ تبسم: سماجی و جنسی حقیقت نگاری (www.urdulinks.com(date: 27,07, 2026, 11:00pm

xii قوسِ خیال، واجدہ تبسم، افسانوی مجموعہ "اترن" اور سیز بک سینٹر، بمبئی، طبع اول، ۱۹۷۷ء، ص ۷، ۶

xiii بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب، ترنم ریاض، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۲۹۳

xiv واجدہ تبسم، تہہ خانہ، اسرار کریمی پریس، الہ آباد، ۱۹۶۸، ص ۱۸۲

xv ایضاً، ص ۱۸۷، ۱۸۶